رضوان اللہ

ختم شد

(۲)

۲۔ ایمان ہی نجات کی دلیل ہے

ہمیں عدل پر قائم ایک ہستی کی طرف سے امتحان میں مبتلا کیا گیا ہے، اس لیے یہ بات لازم قرار پائی ہے کہ آخرت میں کامیابی کا مکمل انحصار ہمارے اپنے کمائے ہوئے اعمال پر ہو۔ بلکہ رسولوں کے اتمام حجت کے بعد برپا ہونے والی عدالت میں بھی نجات کا یہی معیار برقرار رکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں رنگ، نسل یا اس طرح کی کسی بھی غیر کسبی شے کو ہرگز استثنا نہیں دیا گیا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ از اول تا آخر، یہی اصول اپنی پوری شان سے کار فرما ہے۔ مثال کے طور پر، حضرت نوح اپنی قوم کو دعوت دیں یا اُنھیں تنبیہ کریں۔ نجات کی دعا کریں یا عذاب کی درخواست کریں۔ خدا اپنے عذاب کا فیصلہ سنائے یا نجات پانے والوں کا بیان کرے۔ کامیابی کا مژدہ سنائے یا ناکام ہونے والوں پر لعنت کا بیان کرے؛ اس طرح کے ہر موقع پر ایمان و کفر، توحید و شرک، رسول کی معیت اور اس کی تکذیب ہی کا صراحت سے ذکر ہوا ہے[۱۹]۔ اور یہی

۱۹۔ ان تمام تصریحات کے لیے ترتیب سے یہ آیات دیکھ لی جا سکتی ہیں: 'اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ' (ہود ۱۱: ۲۶)۔ 'وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ' (ہود ۱۱: ۴۲)۔ 'وَنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' (الشعراء ۲۶: ۱۱۸)۔ اور 'وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا' (نوح ۷۱: ۲۸)۔ 'رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وجہ ہے کہ جب کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا گیا تو اس وقت بھی حضرت نوح سے فرمایا ہے کہ وہ صرف اور صرف ایمان والوں کو اس میں سوار کریں۔

اب اس طرح کے محکم اور صریح اصول میں بھی اگر کوئی صاحب رخنہ پیدا کر دینا چاہیں تو اس میں شک نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کر گزرنے میں آزاد ہیں، مگر لازم ہے کہ اِس کے لیے وہ خدا کی کتاب میں سے بہت ہی واضح نص لے کر آئیں۔ اور یہ ان پر اسی طرح سے لازم ہے جیسا کہ مثال کے طور پر، زمین و آسمان پر صرف ایک خدا کی خدائی قائم ہے اور انسانوں میں انسان ہی رسول بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ اب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ کسی سیارے پر اُس کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی حکومت کرتا ہے اور فرشتوں کو بھی کبھی کبھار انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیج دیا جاتا ہے تو ظاہر ہے، اس طرح کا استثنا لانے کے لیے اسے بڑی ہی مضبوط دلیل چاہیے ہو گی۔ لیکن ان حضرات کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت نوح کے اہل و عیال کو جب نجات کے قانون سے مستثنیٰ قرار دینے کی کوشش کی تو اس کے لیے کوئی صریح اور واضح نص ہرگز پیش نہیں کی، بلکہ حسب معمول یہ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں اور اسی سے اپنا کام نکال لینا چاہتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"استثنا" کی دلیل

ان کی پیش کردہ دلیل یہ ہے:

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

"ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں — اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔"

دَيَّارًا' (نوح ۷۱: ۲۶)۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ' (ہود ۱۱: ۳۷)۔ 'فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ' (الاعراف ۷: ۶۴)۔ 'اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ' (ہود ۱۱: ۴۹)۔ 'وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ' (ہود ۱۱: ۴۴)۔

آیت کو بار بار پڑھ کر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس میں نجات کے عمومی اصول سے کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا اور حضرت نوح سے قطعاً یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اہل و عیال کو ایمان کے بغیر اور محض اپنے اہل ہونے کی بنیاد پر کشتی میں سوار کرا لیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کو ایک اشارہ پیدا کر کے اسی پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔ ان کے لفظوں میں آیت میں سے "یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ حضرت نوح کے اہل خانہ کو محض اُن کے اہل ہونے کی بنا پر بھی سوار ہونے کی اجازت تھی۔" "اس لیے کہ یہاں "'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف 'اَهْلَكَ' سے مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔" اور "ایمان کے بجائے رشتہ داروں کی طرف دلالت کرتا ہے۔" اس بات کی تائید میں انھوں نے ایک اور آیت میں سے 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے الفاظ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ "جب آپ کا بیٹا کشتی میں سوار ہونے سے روک دیا گیا[20] تو اس وقت یہی کہا گیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں ہے، جب کہ اگر اہل خانہ کے لیے ایمان کی شرط ہوتی تو کہا جاتا کہ وہ ایمان والوں میں سے نہیں ہے۔"

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مغالطے

غور کیا جائے تو ان کی طرف سے بیان کردہ دو عدد "اشاروں" میں کم سے کم چار عدد مغالطے پائے جاتے ہیں:

۱۔ مغایرت کا مطلب یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں ہر لحاظ سے مغایرت پائی جائے گی۔

۲۔ مغایرت کس اعتبار سے ہے، اس کا فیصلہ معطوف کے لحاظ سے کیا جائے گا۔

۳۔ اس آیت میں 'اَهْلَكَ' سے مراد نوح کے سب گھر والے ہیں۔

۴۔ دوسری آیت کے جملے 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' میں بھی 'اَهْلِكَ' مطلق طور پر آیا ہے اور اس سے مراد نوح کے سب گھر والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح میں غرق ہونے والا شخص حضرت نوح کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔

ازالہ

ان مغالطوں کا ازالہ کرنے کے لیے ذیل کی چند باتیں سامنے رہنی چاہییں:

۱۔ اس میں شک نہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان میں مغایرت بھی ہوتی ہے، مگر اس سے یہ

۲۰۔ معلوم نہیں یہ قرآن کی کس آیت میں بیان ہوا ہے کہ نوح کے بیٹے کو کشتی میں سوار ہونے سے روک دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان حضرات کے ہاں موجود اکتیسویں پارے کی کوئی آیت ہو۔

لازم نہیں آتا کہ ان دونوں میں کوئی ایک بات بھی مشترک نہ ہو گی اور وہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گے۔ مثلاً، اس آیت میں فرمایا ہے:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۷۰) "انھوں نے بے اختیار کہا: ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔"

یہاں 'مُوْسٰى' کا لفظ 'هٰرُوْنَ' پر عطف کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں آپس میں متغایر ہیں، مگر جان لیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہوئے بھی بہت سے پہلوؤں سے بالکل ایک جیسے ہیں، جیسا کہ انسان ہونے کے ناتے اور اسلام پر قائم ہونے اور خدا کا پیغمبر ہونے کے لحاظ سے۔ زیر بحث آیت کی بھی یہی نوعیت ہے۔ 'وَمَنْ اٰمَنَ' اس آیت میں 'وَاَهْلَكَ' پر عطف ہوا ہے، اس لیے یہ بات تو طے ہے کہ جن دو گروہوں کا اس میں ذکر ہوا ہے، وہ ایک دوسرے کے غیر ہیں، مگر اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ یہ اپنے اوصاف میں ہر لحاظ سے مختلف ہیں، یہاں تک کہ اسلام اور کفر کے معاملے میں بھی۔

۲۔ ان حضرات کے مطابق عطف کی یہ مغایرت معطوف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے انھوں نے 'وَاَهْلَكَ' کے معطوف علیہ میں 'وَمَنْ اٰمَنَ' کے معطوف کی وجہ سے یہ معنی پیدا کر دیا ہے کہ یہاں نوح کے اہل کا ایمان اب زیر بحث نہیں رہا۔ دراں حالیکہ اصل اصول یہ ہے کہ یہ مغایرت معطوف کے بجائے معطوف علیہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی، جو بات پہلے بیان کی جاتی ہے، اس کے بعد آنے والی بات اسی کے لحاظ سے غیر اور مختلف سمجھی جاتی ہے کہ یہی کلام کی ترتیب اور اُس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ مثال کے لیے ذیل کی آیت دیکھ لی جائے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ. (الانعام ۶: ۱۹) "اور میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں اور انھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔"

اس آیت میں 'كُمْ' معطوف علیہ ہے اور اس کے مطابق مغایرت اس طرح سے بنتی ہے کہ "اس کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں اور تمھارے علاوہ اُنھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔"

اسی طرح زیر بحث آیت کا معاملہ ہے۔ اس میں 'وَاَهْلَكَ' معطوف علیہ ہے، چنانچہ اس کی روشنی میں ہم اس کے معطوف یعنی، 'وَمَنْ اٰمَنَ' کی مغایرت بیان کریں گے جو یہ بنے گی کہ "اے نوح، اپنے گھر والوں کو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اور انھیں جو تیرے گھر والے تو نہیں ہیں، مگر ایمان لائے ہوئے ہیں، اپنی کشتی میں سوار کرا لو۔‘‘

صحیح اصول جان لینے کے بعد اب ان حضرات کے خود ساختہ اصول کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس کے نتیجے میں مغایرت کے نام سے کیا کچھ مضحکہ خیزیاں وجود میں آسکتی ہیں۔ مثال کے لیے پہلی آیت کے ترجمہ پر دوبارہ سے نظر ڈال لی جائے:

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ. (الانعام ۶:۱۹)

’’اور میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں اور انھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔‘‘

یہ اس کا سیدھا اور صاف مطلب ہے، مگر ان کے اصول کے مطابق ’وَمَنْۢ بَلَغَ‘ یہاں اس بات کا قرینہ ہوگا کہ ’كُمْ‘ میں ابلاغ کا معنی نہیں رہا، اس لیے اب اس کا مطلب ہوگا کہ ’’اس قرآن کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں کہ جنھیں یہ نہیں پہنچا اور انھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔‘‘

بلکہ زیر بحث پوری آیت کا مطلب بھی دیکھ لیا جائے کہ وہ کیسی عجیب صورت اختیار کر لیتا ہے: ’’اے نوح، تم ان سب جانوروں کو جو تیرے گھر میں نہیں رہے اور اپنے اُن گھر والوں کو جو ابھی تک ایمان نہیں لائے اور ایمان والوں کو اپنے ساتھ کشتی میں سوار کرا لو۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ ان کا کہنا ہے کہ زیر بحث آیت میں ’اَهْلَكَ‘ سے مراد حضرت نوح کے تمام اہل و عیال ہیں اور جہاں تک ان کے صاحب ایمان ہونے کا تعلق ہے تو ’’یہاں لفظوں میں کوئی قرینہ ایمان کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔‘‘ اس پر ہم عرض کریں گے کہ انھیں لاحق ہونے والا یہ بھی ایک صریح مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ ’اَهْلَكَ‘ پر تو دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ واضح طور پر ’اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ‘ کے الفاظ آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ الفاظ چونکہ مخصِص کے طور پر آئے ہوئے ہیں، اس لیے یہ کسی صورت ممکن نہیں رہا کہ اسے مطلق رہنے دیا جائے اور نوح کے سب اہل کے معنی میں لے لیا جائے۔ بلکہ اُن کے اہل میں سے اب صرف وہ لوگ مراد ہو سکتے ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا، یعنی وہ شرک سے بچے ہوئے اور ایمان لے آئے ہوئے لوگ ہیں[۲۱]۔

۴۔ ایک آیت میں ’اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ‘ کا جملہ نقل ہوا ہے۔ ان حضرات کو مغالطہ ہوا ہے کہ اس

۲۱۔ بلکہ ایک دوسرے مقام پر آنے والے ’وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا‘ کے الفاظ بھی اس کے ساتھ ملا لیے جائیں تو یہ تخصیص اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ المومنون ۲۳:۲۷۔

میں آنے والا لفظ 'اَهْلِكَ' مطلق طور پر استعمال ہوا ہے، اس لیے غرق ہونے والے شخص کے بارے میں جب کہا جائے گا کہ وہ نوح کے اہل میں سے نہیں ہے تو اس کا مطلب ہو گا کہ وہ حضرت نوح کا حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اس مغالطے کے ازالے کے لیے آیت میں آنے والے 'اَهْلِكَ' کو بھی اس کے سیاق میں رکھ کر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے۔ اس سلسلۂ کلام میں یہ لفظ پہلے آیت ۴۰ میں آیا ہے اور وہاں اس کا استعمال اپنے عموم کے بجائے تخصیص میں ہوا ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل گزری۔ سو اس میں پائی جانے والی یہی تخصیص ہے جو اِعادۂ معرفہ کے اصول پر اس واقعہ کے تفصیلی بیان میں آخر تک موجود رہی ہے، حتیٰ کہ مذکورہ جملے 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' میں بھی یہ مکمل طور پر قائم ہے۔ یہ تخصیص اگر سمجھ لی جائے تو اب دو باتیں بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں بھی 'اَهْلِكَ' سے مراد نوح کے سب گھر والے نہیں، بلکہ ان میں سے صرف وہ لوگ مراد ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا، یعنی وہ نجات پانے والے لوگ ہیں۔ دوسرے یہ کہ 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے اس جملے کا مطلب اب یہ نہیں ہو سکتا کہ اے نوح، وہ غرق ہونے والا شخص تمھارے خاندان کا فرد نہیں تھا۔ بلکہ اس کا مطلب ہو گا کہ وہ تمھارے خاندان کے اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو خدا کے عذاب سے نجات پا جانے والے تھے۔

باقی رہا اس شخص کی ابنیت کا معاملہ تو اس کے لیے مذکورہ آیت کے بجائے اُس مقام کو دیکھ لینا زیادہ مناسب ہے جس میں خداے علام نے نہایت واضح الفاظ میں اُسے نوح کا بیٹا قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے:

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قف وَنَادٰى نُوْحُ اِۨبْنَهٗ. (ہود ۱۱: ۴۲)

"وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے درمیان اُن کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔"

"استثنا" کا رد

نجات کے عمومی معیار میں استثنا لانے کی کوششوں کا رد ہم نے دو طریقوں سے کیا ہے۔ ایک یہ واضح کر کے کہ ان حضرات کے بیان کردہ استثنا کے حق میں کوئی بھی صریح نص موجود نہیں، بلکہ اگر کوئی چیز اس کے پیچھے ہے تو وہ تہ در تہ مغالطوں کی ایک دنیا ہے۔ دوسرے یہ بتا کر کہ قرآن میں ایجابی طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت نوح کے اہل کے معاملے میں بھی نجات کا عمومی قانون کارفرما رہا اور اُن کا فیصلہ بھی محض اہل ہونے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اُن کے ایمان اور کفر کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس ذیل میں ہم نے دو آیات کو پیش کیا ہے:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پہلی آیت

ارشاد ہوا ہے:

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ لا فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ج وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ج اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ.

(المومنون ۲۳:۲۷)

''پھر جب ہمارا حکم آجائے اور طوفان ابل پڑے تو اس میں ہر قسم کے جانوروں کے جوڑے رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو، ان میں سے سوائے ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہنا جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ وہ لازماً غرق ہو کر رہیں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آیت کے اجزا کے بارے میں چند باتیں ملحوظ رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ آیت میں 'سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد اصل میں مشرکین کے بارے میں سنا دیا گیا فیصلہ ہے کہ جس کے مطابق وہ خدا کے عذاب کی لپیٹ میں آ کر رہیں گے۔

دوسرے یہ کہ آیت میں آنے والے 'اَهْلَكَ' سے مراد خاندان نوح کے افراد ہیں۔ اور مومنین کے عمومی لفظ کو چھوڑ کر اسے لایا گیا ہے تو اس کی وجہ علی سبیل التغلیب کا اسلوب ہے۔ اس اسلوب کا استعمال یہاں اس لیے کیا ہے کہ حضرت نوح پر زیادہ تر آپ کے خاندان کے لوگ ایمان لائے تھے، اس لیے مومنین کے اس معتدبہ حصے کا بیان کر دیا تو گویا سب مومنین کا بیان کر دیا گیا۔

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو کر جب اپنے خدا سے دعا کی تو اُنھیں حکم ہوا کہ ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہماری ہدایت کے مطابق تیار کرو۔ پھر جب فیصلے کا وقت آجائے اور طوفان ابل پڑے تو 'فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ'۔ اس میں اپنی ضرورت کے تمام جانوروں کے جوڑے رکھ لینا۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'وَاَهْلَكَ'۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی اس میں سوار کرا لینا۔ کشتی میں سوار ہونے کا مطلب اصل میں خدا کے عذاب سے نجات پانا تھا اور وہ صرف ایمان والوں کا نصیب تھی، اس لیے آپ سے خصوصاً فرمایا گیا: 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ' کہ اپنے خاندان میں سے اُن افراد کو ہرگز اس میں سوار نہ کرانا جو ایمان والے نہ ہوں اور اس وجہ سے اُن پر خدا کا فیصلہ

صادق آ چکا ہو۔ اس کے بعد یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ تمھارے خاندان میں سے جو لوگ تم پر ایمان نہ لائیں، وہ ظالم ہیں، اس لیے 'وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا'۔ ان ظالموں کی ہم دردی اور سفارش میں ہم سے کوئی بات نہ کہنا۔ 'اِنَّھُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ'، وہ بہر صورت غرق کر دیے جائیں گے۔

دوسری آیت

قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡھَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَاَھۡلَکَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ وَمَنۡ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

''ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سواے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ــــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔''

اس آیت کے اجزا کے بارے میں بھی چند چیزیں جان لینی چاہییں:

ایک یہ کہ اس میں 'وَمَنۡ اٰمَنَ' کو 'اَھۡلَکَ' پر عطف کیا گیا ہے۔ یہ عام بعد الخاص کی نوعیت کا عطف ہے اور تعمیم کے لیے آیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کشتی میں سوار کرنے کے حکم کا دائرہ خاندان سے باہر کے مومنین کو بھی محیط ہو گیا ہے۔ یعنی، اس کا مطلب اب یہ ہے کہ اے نوح، تم نہ صرف اپنے گھر والوں، بلکہ دوسرے مومنین کو بھی اس کشتی میں سوار کرا لو۔

دوسرے یہ کہ آیت میں 'اَھۡلَکَ' پر 'اِلَّا' کے ذریعے سے تخصیص لائی گئی ہے۔ یہ جس پر آتی ہے اُس کے بعض افراد کو چونکہ اُس میں سے خارج کر دیتی ہے، اس لیے یہ بات طے ہے کہ اس لفظ میں اب نوح کے خاندان کے سب افراد شامل نہیں رہے، بلکہ اُس کے بعض افراد، لامحالہ اِس میں سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور مزید یہ کہ خاندان کے افراد ہونے کے باوجود، اس لیے خارج ہو گئے ہیں کہ وہ مشرک ہیں اور خدا کے فیصلے کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ 'اَھۡلَکَ' کے اندر یہ تخصیص ایک اور طرح سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اس پر آنے والا 'مَنۡ اٰمَنَ' کا عطف ایک ہی وقت میں جس طرح یہ بتا رہا ہے کہ وہ 'اَھۡلَکَ' کا غیر ہے، اسی طرح اپنے اندر موجود ایمان کا ایک رنگ بھی اس میں پیدا کر رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اجزا کی وضاحت کے بعد اب آیت کا مفہوم بڑی آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اصل میں اُس موقع کا بیان ہے جب عذاب کا وقت قریب آن لگا ہے اور نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ضرورت کے تمام جانوروں کے جوڑے کشتی میں رکھ لیں۔ یہ جانور غیر ذوی العقول ہیں اور اس دنیا میں برپا کیے گئے امتحان سے قطعی طور پر لاتعلق ہیں، اس لیے اُن میں سے کون سا جوڑا رکھا جائے، اس کا پیمانہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ جانور ہوں اور اُن کی ضرورت کے جانور ہوں۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'وَاَهْلَكَ' اور اس کے ساتھ اپنے اہل کو بھی سوار کرا لیں۔ اُن کے اہل ہم جانتے ہیں کہ ذی شعور انسان ہیں اور اس وجہ سے دنیا میں برپا ہوئے امتحان سے گزر رہے ہیں، اس لیے ان میں سے کون سوار کیا جائے، اس کا فیصلہ ان کے اہل ہونے کے بجائے ان کی اہلیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ سب لوگ آپ کی رسالت کے بھی براہ راست مخاطب ہیں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان میں سے صرف ایمان والے کشتی میں سوار کرائے جائیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ 'اَهْلَكَ' پر 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' لا کر اس بات کو بالکل صراحت کے ساتھ بھی بیان کر دیا گیا۔ یعنی، 'اِلَّا' کی اس تخصیص سے بتا دیا کہ اُن کے اہل میں سے صرف صاحب ایمان کشتی پر سوار ہو سکیں گے اور جو شرک پر قائم ہیں اور اس طرح خدا کے فیصلے کی زد میں آ چکے ہیں، وہ سوار ہونے سے یک سر محروم رہیں گے۔ اس کے بعد 'اَهْلَكَ' پر 'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف لایا گیا ہے۔ اس عطف نے جس طرح دیگر مومنین کو بھی اس حکم میں شامل کر لیا ہے، اسی طرح ایک زائد قرینہ اس بات کا بھی فراہم کر دیا ہے کہ 'اَهْلَكَ' سے مراد یہاں صرف مسلمان اہل ہیں۔ اس لیے کہ اس سیاق میں عطف کے ان الفاظ کا صحیح مطلب بنتا ہے: "اور دوسرے ایمان والے بھی"۔ اور غور سے دیکھا جائے تو یہ "دوسرے" کا مفہوم بھی اصل میں 'اَهْلَكَ' کے اندر ایمان والوں کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اعتراضات

دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتیں اس معاملے میں بالکل قطعی ہیں کہ نوح علیہ السلام کے خاندان کا فیصلہ بھی اسلام کے عام قانون نجات کے مطابق ہی ہوا اور کسی بھی شخص کو محض اُن کے اہل ہونے کی بنیاد پر رتی بھر کوئی رعایت نہیں دی گئی۔ مگر ان آیتوں کی ہماری طرف سے پیش کردہ وضاحت پر ان حضرات کی طرف سے کچھ اعتراضات کر دیے گئے ہیں:

۱۔ کہا گیا ہے کہ ہم نے مختلف مقامات پر ایک ہی لفظ اور ایک ہی آیت کے مختلف تراجم کیے ہیں۔ مثلاً، اگر 'ذُرِّيَّتَهُمْ' سے کبھی "اولاد آدم" مراد لی ہے اور کبھی "ان کی نسل"، تو اسی طرح 'وَمَنْ اٰمَنَ' کا ترجمہ ایک

جگہ یہ کیا ہے: ''اور ان کو بھی جو ایمان لائے ہیں۔'' اور ایک مقام پر اس میں لفظ ''دوسرے'' کا اضافہ کرتے ہوئے یوں ترجمہ کیا ہے: ''اور دوسرے مومنین کو سوار کرالو۔''

کسی لفظ اور آیت کو ایک سے زیادہ طریقوں سے ترجمہ کرنا نہ تو غلط ہے اور نہ یہ راے میں ''متلون'' مزاج ہونے کا غماز ہے۔ لفظوں کے چناؤ میں اصل معیار جس طرح مترجم کا فہم اور اُس کا ذوق انتخاب ہوتا ہے، اسی طرح وہ مقاصد بھی اس میں معیار ہوتے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر یہ ترجمہ کیا جا رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، کبھی مترجم آیت کا لفظی ترجمہ کرنا چاہتا ہے اور کبھی سلیس اور بامحاورہ۔ کبھی وہ آیت کی نحوی تالیف بتانا چاہتا ہے تو کبھی وہ اس میں پائے جانے والے کسی خاص پہلو کی وضاحت اور اسی طرح کے دیگر مقاصد کے پیش نظر ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے، یہ سب ترجمے مختلف الفاظ میں کیے جائیں گے، مگر اس کے باوجود یہ سب ایک ہی آیت کے اور بالکل صحیح ترجمے ہوں گے۔ سو اسی طرح کا معاملہ ان مقامات کا ہے جن پر یہ حضرات معترض ہو بیٹھے ہیں۔ ''اولاد آدم'' اور ''ان کی نسل'' یہ اصل میں 'ذُرِّيَّتَهُمْ' کے دو مختلف ترجمے نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی مدعا کی اردو زبان میں دو مختلف تعبیرات ہیں۔ گویا مترجم کے ہاں یہ دونوں مترادفات ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''ان کی نسل'' سے ''ان انسانوں کی نسل'' مراد لے رہا ہے۔ اسی طرح 'وَمَنْ اٰمَنَ' کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک مقام پر ''دوسرے'' کا جو اضافہ کیا گیا ہے تو اس سے مقصود فقط اس لفظ کی وہاں موجودگی کی صراحت کر دینا ہے[۲۲]، وگرنہ یہ اُس جگہ بھی موجود ہے، جہاں عربی اسلوب کی موافقت میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

باقی ان کا یہ اعتراض کرنا کہ اس ''دوسرے'' کے لیے عربی متن میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے تو اس پر ہم بتانا چاہیں گے کہ قرآن کریم کی عربی میں اس طرح کے الفاظ کبھی صراحت سے ذکر کر دیے جاتے ہیں اور کبھی ذکر تو نہیں کیے جاتے، مگر کلام کی ساخت اور اُس کی دلالت سے آپ سے آپ سمجھ لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک مقام پر اس کے لیے ''اُخَرَ'' کا لفظ لاتے ہوئے فرمایا ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (البقرہ ۲: ۱۸۴)

''پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔''

مگر ذیل کی آیت میں اسے ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا:

۲۲۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نظر مفسرین بھی بعض اوقات اسے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں، جیسا کہ صاحب الکشاف نے اس موقع پر لکھا ہے: یعنی: 'واحمل اهلك والمومنين من غيرهم'۔

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ. (آل عمران ۳: ۸۴)

''اور جو چیز موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دی گئی۔''

یہاں یہ عربی متن میں موجود نہیں ہے، مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے باوجود یہ ہر طرح سے واضح ہے، اور قرآن کے طالب علموں کو تو گویا بول بول کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

بلکہ ہم عرض کریں کہ بعض الفاظ تو ایسے بھی ہیں کہ جن کے لیے عربی زبان کا کوئی لفظ پورے قرآن میں ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں ہوا، جیسا کہ ''بھی'' کا لفظ، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اہل علم اپنے ترجموں میں اسے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ شاید یہ بھی ہوتی ہے کہ انھیں اس بات کا بالکل ڈر نہیں ہوتا کہ کوئی معترض صاحب اس معاملے میں بھی اعتراض کر دیں گے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر عربی متن میں سے اس کا متبادل دکھا دینے کی ضد بھی کریں گے۔

۲۔ ہم نے 'اَهْلَكَ' پر 'مَنْ اٰمَنَ' کے عطف کو بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ ان دونوں کی مغایرت کو بیان کر رہا ہے۔ یہ بھی بتایا تھا کہ یہ عام بعد الخاص کا عطف ہے اور تعمیم کے لیے آیا ہے۔ مزید یہ بھی بتایا تھا کہ یہ 'اَهْلَكَ' میں ایک طرح کی تخصیص بھی پیدا کر رہا ہے۔ ایک ہی عطف سے اس قدر متنوع استدلال کر دکھانے پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خوب خوب داد دی جاتی یا کچھ اور نہیں تو اس طرح کی چیزوں پر آیندہ سے غور کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا، اُلٹا یہ اعتراض کر دیا گیا ہے کہ شاید ہمارے پاس کوئی ''جادوئی عطف'' ہے جو ایک ہی وقت میں یہ سارے کام کر لیتا ہے۔

اس طرح کے ''جادوئی عطف''، ہم عرض کریں کہ بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان حضرات کو دکھائے بھی جا سکتے ہیں، شرط بس اتنی ہے کہ یہ ''اکابرین'' کے مقام بلند سے اتر کر کبھی ہم جیسے طالب علموں کی صف میں بھی آ بیٹھیں۔ ہم بطور مثال ایک آیت پیش کیے دیتے ہیں جس میں یہ بخوبی دیکھ سکیں گے کہ عطف کا یہ سارا تنوع بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ. (الحج ۲۲: ۵۲)

''ہم نے اے پیغمبر، تم سے پہلے جو رسول اور جو نبی بھی بھیجا ہے، اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ اس نے جب بھی کوئی تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا ہے۔''

یہاں 'رَسُوْل' پر 'نَبِی' کے لفظ کو عطف کیا گیا ہے۔ نبی اور رسول اپنی ذات میں ایک ہی ہوتے اور یہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دونوں لفظ بارہا ایک دوسرے کے محل میں استعمال کر لیے جاتے ہیں مگر اس عطف نے بتایا ہے کہ یہاں ان میں مغایرت بیان کرنا مطلوب ہے اور یہ دو لفظ اصل میں دو الگ مناصب کے لیے آئے ہیں۔ دوسرے یہ عام بعد الخاص کا عطف ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ نبی کے مقابلے میں رسول خاص ہوتا ہے، یعنی ہر رسول نبی ہوتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اسے تعمیم کی غرض سے لایا گیا ہے تاکہ بتایا جائے کہ آیت میں بیان کردہ معاملہ صرف رسولوں کو نہیں، بلکہ خدا کے نبیوں کو بھی پیش آتا رہا ہے۔ چوتھے یہ کہ معطوف یہاں معطوف علیہ میں ایک تخصیص بھی پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ 'رسول' کا لفظ اپنے اطلاق میں رسول، نبی، فرشتے اور سفیر، ان سب کے لیے آ جاتا ہے، مگر اس پر ہونے والے 'نبی' کے عطف نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اس میں تخصیص ہو چکی اور اب یہ صرف رسول کے ساتھ خاص ہو گیا ہے۔

۳۔ جب یہ اعتراض کیا گیا کہ ایک ہی لفظ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مغایرت کے ساتھ ساتھ تخصیص کا باعث بھی ہو جائے تو اس پر ہم نے ایک مثال پیش کر کے انھیں بتایا تھا کہ ایسا بالکل ہو سکتا ہے، اور وہ مثال یہ تھی:

''بیٹا، اپنے ساتھ پاکستانیوں، سوائے ان کے جو بالغ ہو چکے ہیں اور دوسرے بچوں کو بھی ساتھ لیتے آنا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس پر اب یہ اعتراض کر دیا گیا ہے کہ یہ مثال قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق نہیں ہے اور اس میں کچھ مسائل ہیں۔ مثلاً، آیت میں ''دوسرے'' کا لفظ نہیں ہے۔ آیت کی ترتیب کے مطابق مثال میں 'بچوں' کا لفظ پہلے آنا چاہیے اور 'پاکستانیوں' کا بعد میں۔ آیت میں عام بعد الخاص کا اسلوب ہے تو مثال میں دونوں جگہ عام لفظ لائے گئے ہیں۔ اور یہ کہ آیت میں 'اهل' کی ضمیر مخاطب کی طرف اضافت ہے اور مثال میں یہ رشتہ موجود نہیں ہے۔

ہم وضاحت کر دیں کہ ہماری طرف سے یہ مثال آیت کا اسلوب سمجھانے کے لیے نہیں، بلکہ اس دعویٰ کو غلط ثابت کر دکھانے کے لیے دی گئی تھی کہ عطف ایک ہی وقت میں مغایرت اور تخصیص کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس مثال سے ہمارا ہدف ہر طرح سے حاصل ہو گیا ہے کہ اس میں پاکستانیوں اور بچوں میں آنے والا عطف مغایرت بھی پیدا کر رہا ہے اور ایک طرح کی تخصیص بھی۔ تاہم، ان لوگوں نے اپنے دعویٰ سے دست بردار ہونے کے بجائے اب یہ نئی بحث اٹھا دی ہے کہ یہ مثال آیت کی ساخت کے خلاف ہے تو لگے ہاتھوں ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور یہ ہر اعتبار سے آیت کے مطابق ہے۔ ہماری دی ہوئی مثال میں اگر ''دوسرے'' کا لفظ موجود ہے تو یہ آیت میں بھی موجود ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل گزری۔ اس کی ترتیب بھی آیت کے بالکل موافق ہے کہ آیت میں پہلے اہل کا ذکر ہوا اور اس کے بعد اُن کا جو اہل نہیں

ہیں، مثال میں بھی اہل پاکستان کا ذکر ہوا اور بعد میں اُن کا جو پاکستانی نہیں ہیں۔ آیت میں عام بعد الخاص کا اسلوب ہے تو مثال میں بھی دونوں جگہ عام الفاظ نہیں لائے گئے، بلکہ پاکستانی خاص بچوں اور بعد میں عام بچوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح آیت میں اگر 'اھل' کا ضمیر خطاب سے تعلق پایا جاتا ہے تو وہ مثال میں بھی ہر طرح سے موجود ہے۔ وہ اس طرح سے کہ یہ ہم پاکستانیوں کی طرف سے دی گئی اردو کی ایک مثال ہے۔ سو اس میں حکم دینے والا باپ اپنے پاکستانی بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے جب یہ کہتا ہے کہ پاکستانیوں کو لیتے آنا تو اس میں، ظاہر ہے کہ اُس کے بیٹے اور ان پاکستانیوں کے درمیان میں اہل پاکستان ہونے کا تعلق ہر لحاظ سے موجود ہے۔

اپنی پیش کردہ مثال کو اس کڑے معیار پر جانچ لینے کے بعد اب ہم چاہیں گے کہ ان حضرات کی دی ہوئی مثال کو بھی پرکھ لیا جائے کہ وہ آیت کی ساخت سے کوئی تعلق رکھتی ہے یا اس سے کوسوں دور ہے۔ ہم ذیل میں ان کی دی ہوئی مثال پیش کرتے ہیں اور پوری امید رکھتے ہیں کہ ہماری طرح سب لوگ چاہے آیت اور اس کے درمیان میں کوئی ادنیٰ سی مناسبت نہ ڈھونڈ سکیں، مگر اسے پڑھ کر وہ پورے دل سے سبحان اللہ ضرور کہہ اٹھیں گے۔ وہ مثال بے مثال یہ ہے:

''بیٹا اپنے بچوں کو اور پاکستانی بچوں کو لیتے آنا۔''

۴۔ تخصیص اور مغایرت کے اکٹھا ہو جانے پر ان کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمیں اب مان لینا چاہیے کہ ''اَحۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَاَهۡلَكَ' کے اس جملے میں 'وَاَهۡلَكَ' کا عطف 'كُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ' سے مغایرت بھی کر رہا ہے اور تخصیص بھی کہ العیاذ باللہ 'كُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ' بھی اہل خانہ میں سے تھے۔''

ان کے اس مطالبہ نما اعتراض کے پیچھے دو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر عطف مغایرت کے ساتھ تخصیص بھی کیا کرتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر کسی جملے میں ایک عطف تخصیص کرے گا تو دوسرا بھی لازماً یہ کام کرے گا۔ یہ غلط فہمیاں اگر دور ہو جائیں تو آپ سے آپ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں دوسرے عطف کی بنیاد پر جانوروں کے لیے بھی تخصیص پر اصرار کرنا ایک بے جا مطالبہ ہے۔ بلکہ یہ مطالبہ اس لیے بھی ناروا ہے کہ دوسرے عطف میں تخصیص پیدا ہو جانے کی جو وجوہات ہیں، وہ جانوروں سے متعلق ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ مثال کے طور پر، اس میں تخصیص آنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عطف اُس موقع پر بیان ہوا ہے جب عذاب سے نجات پانے والوں کا معیار بیان ہو رہا ہے۔ دوسرے اس کے بعد آنے والے معطوف میں ایمان کے وصف کو نمایاں کرنا ہے۔ تیسری وجہ معطوف پر آنے والا ''دوسرے'' کا لفظ ہے۔ چوتھی وجہ اس کے بعد 'وَمَاۤ اٰمَنَ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلٌ ' کا لایا ہوا جملہ ہے کہ جس میں ایمان ہی زیر بحث آیا ہے۔اب ظاہر ہے، ان تمام چیزوں کا تعلق صرف اور صرف دوسرے عطف کے ساتھ موزوں ہو سکتا ہے نہ کہ جانوروں کے حکم پر مشتمل پہلے عطف کے ساتھ۔ سوان لوگوں کو اگر پہلے عطف میں بھی کسی تخصیص کا مطالبہ کرنا ہے تو انھیں جان لینا چاہیے کہ اس کے لیے صرف ''واو'' کو دیکھ لینا یا دوسرے عطف کو بنیاد بنا لینا کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہوگا کہ آیت کے اندر اتر کر کچھ غور و فکر بھی کر لیا جائے اور یوں اس تخصیص کے لیے الگ سے دلائل فراہم کیے جائیں۔

۵۔ہم نے بیان کیا تھا کہ 'اَهۡلَكَ ' پر 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ ' کے الفاظ آئے ہیں اور اس بات کی واضح دلیل ہو گئے ہیں کہ اس میں تخصیص واقع ہو چکی ہے اور اس سے اب حضرت نوح کے تمام گھر والے نہیں، بلکہ ان میں سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے بارے میں عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا۔ اس بات کی وضاحت میں ہم نے بیان کیا تھا کہ عربی زبان میں 'قول' کا مطلب ''بات'' ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ 'علیٰ ' کے استعمال نے یہاں دو چیزیں بالکل واضح کر دی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد اب صرف بات نہیں، بلکہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فیصلہ 'علیه' کی ضمیر کے مرجع کے خلاف ہے۔ اس 'قول' پر آنے والا الف لام اور اس کے ساتھ فعل 'سبق ' کا استعمال سامنے رہے تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پہلے سے سنا دیا ہوا فیصلہ ہے اور مزید یہ کہ اس سے نوح علیہ السلام اچھی طرح سے واقف بھی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ ہے کیا؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وہی فیصلہ ہے جسے انھوں نے اپنی قوم کے سامنے یہ کہتے ہوئے بیان کر دیا تھا: 'يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ '۔[۲۳] ''میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا (اُس کے شریک ٹھیرا کر تم اس کے غضب سے) ڈرتے نہیں ہو۔'' ان کی اس دعوت کا مطلب، ظاہر ہے، یہی تھا کہ جو لوگ صرف خدا کی عبادت کرنے کے بجائے اُس کے شریک ٹھیرائیں گے، اُن کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اُس کے غضب کا شکار ہو کر رہیں گے۔ سو قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق کے لحاظ سے یہی 'سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ ' کا حقیقی مصداق ہے۔

ہمارے اس طویل استدلال پر ایسا نہیں ہوا کہ ان کی طرف سے کوئی نقد کیا گیا ہو اور ہمیں بتایا گیا ہو کہ 'سبق ' کے فعل، اُس کے صلے اور لفظ 'قول' پر آنے والے الف لام سے یہ معنی پیدا نہیں ہو سکتے، بلکہ ان تمام چیزوں سے کمال بے اعتنائی کرتے ہوئے صرف یہ فرمان سنا دیا گیا ہے کہ ان الفاظ میں ''کافر ہونے کا معنی ڈالنے کے لیے

۲۳۔ المومنون ۲۳: ۲۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کلام میں کوئی اشارہ نہیں۔'' طالب علم جان سکتے ہیں کہ دلائل کے مقابلے میں اصرار کرنے کا یہ رویہ علمی دنیا میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس پر مزید کچھ کہنے کے بجائے یہ کرتے ہیں کہ ان الفاظ کا وہ مطلب اب بیان کیے دیتے ہیں جو ان لوگوں کی طرف سے نکالا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''جن اہل خانہ کے بارے میں اللہ نے پہلے کوئی بات کر رکھی ہے۔ وہ کشتی میں سوار نہیں ہوں گے۔ روکنے کی وجہ غیر منصوص ہے، کیونکہ لفظوں میں بیان نہیں ہوئی۔'' ان کے اس مطلب میں دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ جس طرح 'علیٰ' سے صرف نظر کیا گیا اور الف لام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے، اسی طرح روکنے کی وجہ کو غیر منصوص کہہ کر کشتی میں سوار ہونے کے حکم کو سرے سے نامعقول قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ عقلی طور پر بالکل محال ہے کہ حضرت نوح کو ایک حکم اُس کے استثنا سمیت دیا جائے اور عمل کرتے وقت وہ اُس استثنا سے مکمل طور پر ناواقف ہوں۔ بلکہ اس کے بعد تو انھوں نے قیامت ہی ڈھا دی ہے جب کہا ہے کہ اس جملے کو 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ان سے پوچھا جائے کہ 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' کے الفاظ تو اس بات پر دال ہیں کہ وہ بات پہلے سے بتا دی گئی ہے اور حضرت نوح کے علم میں ہے۔ اس کے مقابلے میں 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' کے الفاظ اس سارے واقعہ کے بعد صادر ہوتے ہیں اور یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ نوح اس میں بیان ہوئی بات کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے۔ اب اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے یہ جملہ آخر کس اصول پر 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' کی تفسیر قرار دیا جا سکتا ہے؟

تفنن طبع کے لیے اس ذیل میں ان کی طرف سے بیان کردہ ایک اور نکتہ بھی دیکھ لینا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' کا مصداق ''غیر اہل ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو اہل ہونے کے معیار پر پورا نہیں اترے گا، اسے سوار نہیں کیا جائے گا۔'' ان کے اس تفسیری نکتے کی روشنی میں کہ جو ان کے زعم میں خالص فراہی اصولوں کی روشنی میں مستنبط ہوا ہے، آیت کا مفہوم یہ بن جاتا ہے: ''تم اپنے گھر والوں کو سوار کرا لو۔ البتہ، اپنے ان گھر والوں میں سے انھیں ہرگز سوار نہ کرانا جو تمھارے گھر والے نہ ہوں۔''

۶۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' کے جملے سے پہلے ہی 'اَهۡلَكَ' میں تخصیص آچکی ہے اور اعادۂ معرفہ کے اصول پر یہ کلام کے آخر تک قائم بھی رہی ہے۔ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ اگر اس لفظ میں تخصیص آگئی ہوتی تو اسے اسم ضمیر میں بدلنا چاہیے تھا اور یہ ''جملہ، کلام کی فطرت ہے کہ یوں ہونا چاہیے تھا: 'ان ابنی منهم'۔'' چنانچہ یہاں اعادۂ معرفہ کے بجائے ''اللہ کے الفاظ کو حوالہ بنایا گیا ہے تاکہ بعد کی تفصیلات سے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مجرد رکھا جائے“۔

اس اعتراض میں انھوں نے کئی فنی چیزوں کو خراب کر دیا ہے۔ انھیں درست طریقے سے سمجھنے کے لیے چند باتیں سامنے رہنی چاہییں۔ ایک یہ کہ کلام میں معرفہ کے بعد اس کی ضمیر کا استعمال بھی کیا جاتا ہے، مگر اسے ایک اٹل قاعدہ بنا دینا اور یہ کہنا کہ کلام کی فطرت بہر صورت اس کا تقاضا کرتی ہے، یہ ایک بے جا دعویٰ ہے اور کم سے کم ہمارے جیسے طالب علم اس کی کوئی دلیل ڈھونڈ لانے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ بلکہ ہم تو قرآن میں بہت سی مثالیں اس کے الٹ دیکھتے ہیں کہ اس میں اسم کا ذکر کیا جاتا ہے جو معرفہ بھی ہوتا ہے اور اس میں تخصیصات بھی آچکی ہوتی ہیں، مگر اس کا ذکر دوبارہ سے کرنا ہو تو بعض وجوہ کے پیش نظر اُسی معرفہ کا اعادہ کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے لیے اس ایک آیت کو دیکھ لیا جائے:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِيۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَمَا هُمۡ بِحٰمِلِيۡنَ مِنۡ خَطٰيٰهُمۡ مِّنۡ شَيۡءٍ. (العنکبوت ۲۹: ۱۲)

”اور منکرین ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو اور تمھارے گناہ ہم اٹھا لیں، حالانکہ ان کے گناہوں میں سے وہ کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہاں ’خَطٰيٰكُمۡ‘ میں ’خطایا‘ معرفہ بھی ہے اور اس میں تخصیص بھی واقع ہو چکی ہے کہ اس سے مراد یہاں ایک خاص نوعیت کے گناہ ہیں۔ مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس کے لیے ضمیر نہیں لائی گئی، بلکہ ’خَطٰيٰهُمۡ‘ کے ذریعے سے اسی اسم کو بعینہٖ دہرا دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ یہاں اعادۂ معرفہ ہی ہوا ہے اور کسی قول کا حوالہ نہیں دیا جا رہا، جیسا کہ ان لوگوں نے گمان کر لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ قول کا حوالہ اُس صورت میں بنتا جب اس میں قول کو دہرایا جاتا۔ یعنی، نوح کہتے کہ اے اللہ، تم نے مجھے اپنے اہل کو سوار کرنے کا حکم دیا تھا تو اس قول کے مطابق میرے بیٹے کو کشتی میں سوار ہونا چاہیے تھا، مگر وہ تو اس میں سوار نہیں ہوا۔ بلکہ قول دہرانے کے بجائے اس میں آئے ہوئے معرفہ کو دہرایا گیا ہے کہ اے اللہ، تم نے سوار کرنے کے حکم میں اہل کا ذکر کیا تھا اور انھیں اس عذاب سے بچ جانا تھا تو میرا بیٹا انھی اہل میں سے ہونے کے باوجود آخر کیوں ہلاک ہوا؟ مگر ہم اس بحث میں پڑنے کے بجائے عرض کرتے ہیں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ قول کا حوالہ ہے تو اس سے یہ بات کہاں سے لازم آگئی کہ اس کا اعادہ کیا جائے گا تو اب اس میں کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی؟ قرآن میں تو بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مخصص شے کا

حوالہ دیا جاتا ہے، مگر اس کا اعادہ کرتے ہوئے یہ لازم نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں پائی جانے والی تخصیصات اب ختم ہو گئی ہیں۔ ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں:

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. ... قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ. قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ. ... قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ. ... قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ.
(الشعراء ۲۶: ۱۶-۲۸)

موسیٰ و ہارون سے فرمایا ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادے ہیں۔ ان کے اس قول میں 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' معرفہ بھی ہے اور مخصص بھی۔ اس کے بعد فرعون نے اسی رب کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا ہے کہ مجھے بتاؤ، وہ رب کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ وہ زمین و آسمان کا رب ہے۔ اور اس کے بعد طنز اور استہزا کو نظر انداز کرتے ہوئے بار بار اسی رب کے حوالے سے حقائق کو بیان فرمایا ہے۔ اب ہر طالب علم خود ہی دیکھ لے سکتا ہے کہ یہاں 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' میں پیدا ہو جانے والی تخصیص شروع سے لے کر آخر تک ہر طرح سے موجود رہی ہے اور کہیں بھی اس سے صرف اس وجہ سے مجرد نہیں ہو گئی کہ یہاں کسی ''قول کا حوالہ'' دیا جا رہا ہے۔

۷۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ اللہ کے ہاں طوفان نوح میں غرق ہونے والا شخص حضرت نوح کا حقیقی بیٹا تھا اور اسی لیے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اُس نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں: 'وَنَادٰى نُوْحُ اِبْنَهٗ'۔ یعنی، نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ تو حکایت ماجرا ہے، اس لیے یہ اس کے کرداروں کے علم کی رعایت ہے اور اسے حقیقت کا بیان کسی صورت نہیں کہا جا سکتا۔

اس اعتراض کے جواب میں چند باتیں سامنے رہیں: ایک یہ کہ یہ حکایت خدا کی طرف سے ہو رہی ہے، اس لیے لازم ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات ہرگز نہ بیان کی جائے جو واقعہ کے بالکل خلاف ہو۔ دوسرے یہ کہ قرآن کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ حکایت کرتے ہوئے محض لوگوں کے علم کی رعایت سے حقائق کے خلاف کوئی بات کر دی جائے۔ خدا کی طرف سے کہی جانے والی بات کبھی مخاطبین کے مزعومات کے مطابق ہوتی ہے اور بعض اوقات ان کے خلاف بھی ہوتی ہے، مگر یہ طے ہے کہ وہ حقیقت کے خلاف کبھی نہیں ہوتی۔ پہلی صورت کی مثال وہ آیت ہے جس میں فرمایا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا، اور ہم جانتے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہیں کہ یہ وہ بات ہے جو حضرت ابراہیم کے ہاں بھی مسلم ہے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا. (مریم ۱۹: ۴۲)

”جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان، آپ ان چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آسکتی ہیں؟“

دوسری کی مثال وہ آیت ہے جس میں فرمایا ہے کہ منکرین نے اپنے رسولوں سے یہ بات کہی، حالانکہ منکرین کے زعم کے مطابق وہ خدا کے رسول ہر گز نہیں ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا. (ابراہیم ۱۴: ۱۳)

”منکروں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تم کو اپنی اس سرزمین سے لازماً نکال دیں گے یا تمھیں (بالآخر) ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔“

غرض یہ کہ 'وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ' کے الفاظ اللہ کی طرف سے بیان کردہ ہیں، اس لیے لازمی طور پر حقیقت واقعہ پر مبنی ہیں۔ چنانچہ یہ کسی طور جائز نہیں ہے کہ ان پر حکایت ماجرا کے اصول کا اطلاق کر کے اس کی نفی کر دی جائے کہ ایسا کرنا گویا خدا کے الفاظ اور اُس کے علم کی مطلق طور پر نفی کر دینا ہے، اور نتیجے کے اعتبار سے تکذیب کے دروازے کو کھول دینا ہے کہ اب اس اصول کی بنیاد پر جو شخص جب چاہے قرآن میں بیان کردہ کسی بھی حقیقت کا انکار کر دیا کرے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں ان حضرات سے ایک سوال بھی پوچھ لینا چاہیے۔ ان کا کہنا کہ یہ بات نوح کے مزعومات کے مطابق کہی گئی ہے جو اسے غلطی سے اپنا بیٹا خیال کرتے تھے، ان سے پوچھنا چاہیے کہ اس اطلاع کا ماخذ ان لوگوں کے پاس آخر ہے کیا؟ اگر یہ کہیں کہ 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کا جملہ اس کا ماخذ ہے تو اول تو ہم کہیں گے کہ یہاں اسے بطور دلیل پیش کرنا انھی کے مانے ہوئے اصولوں کے مطابق صحیح نہیں ہے کہ اس کا معنی ہمارے اور ان کے درمیان میں ابھی زیر بحث ہے۔ دوسرے یہ کہ اس جملے میں بھی یہ کہاں بیان ہوا ہے کہ وہ شخص نوح کا بیٹا نہیں ہے؟ اس میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نوح کی التجا ہو یا خدا کی طرف سے دیا گیا اس کا جواب ہو، ان دونوں میں اُس شخص کی ابنیت سرے سے زیر بحث نہیں آئی کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے بالکل دوسرے الفاظ لائے جاتے۔ یعنی، حضرت نوح کی دعا کے جواب میں 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کہنے کے بجاے 'انه ليس ابنك' یا 'انه ليس من ابناءك' کہا جاتا کہ اے نوح، وہ تو تمھارا بیٹا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہاں ایک اور استدلال کرنا چاہیں گے۔ وہ یہ کہ 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے جملے میں تو اس کے برعکس، اس بات کا اشارہ

موجود ہے کہ خدا کے ہاں اس شخص کا نسب بالکل حقیقی ہے۔ اس لیے کہ 'اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ' کے بعد جب 'اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' کہا جائے گا تو اس 'اِنَّهٗ' کا مطلب اصل میں 'ان ابنك' ہو گا۔ یعنی، اسے کھول دیں تو اصل عبارت یوں بنے گی: 'ان ابنك ليس من اهلك'۔ بے شک تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اور ہر صاحب علم جان لے سکتا ہے کہ یہ جملہ اُسے نوح کا بیٹا مان لینے کے بعد ہی اُس کے اہل میں سے ہونے کی نفی کر رہا ہے۔

حکایت ماجرا کے تناظر میں 'وَنَادٰی نُوۡحُ اِبۡنَهٗ' کی اس قدر وضاحت کر دینے کے بعد ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ ذوالقرنین کی مثال پر اب کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ، ہم طالب علموں کے لیے وہ بنیادی فرق ضرور بیان کیے دیتے ہیں جو ان دو مثالوں میں باہمی طور پر پایا جاتا ہے۔ ذوالقرنین کی مثال میں سورج کو سیاہ چشمے میں ڈوبتے ہوئے دیکھنا انسانی آنکھ کا مشاہدہ ہے اور جس مقام کو سورج کے غروب ہونے کی جگہ کہا گیا ہے، اس کا علم بھی مخاطبین کے ہاں ان کی آنکھوں کے مشاہدے ہی سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل جائز ہے کہ حقیقت جاننے کے باوجود اس طرح کے مشاہدے کا اعتبار کرتے ہوئے اس کی روایت کی جا سکے۔ مگر اس کے مقابلے میں ابن نوح کے نسب کا حقیقی ہونا یا نہ ہونا، ایسا معاملہ نہیں ہے کہ اس میں ایک بات حقیقت پر مبنی ہو اور دوسری آنکھ کا ظاہری مشاہدہ ہو، بلکہ یہ ایک معنوی معاملہ ہے اور اس میں ایک بات حقیقت ہوتی ہے اور دوسری خلاف حقیقت ہوتی ہے اور قرآن میں کبھی ایسا نہیں ہو گا کہ خدا کی طرف سے کسی خلاف حقیقت بات کی روایت کر دی جائے[24]۔ چنانچہ جو حضرات اس ذیل میں کوئی مثال پیش کرنا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اس طرح کی مثال پیش کریں جس میں خدا کی طرف سے آنکھ کے مشاہدے کے بجائے معنوی لحاظ سے کسی غلط بات کی روایت کی گئی ہو۔

حاصل بحث

اس ساری بحث کو چند نکتوں میں سمیٹ لیا جا سکتا ہے:

۲۴۔ اس فرق کو ایک اور طرح سے بھی سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ قرآن میں مثال کے طور پر، یہ تو عام بیان ہوتا ہے کہ اللہ بارش برساتا ہے اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی عطا کر دیتا ہے، مگر اس میں کبھی ایسا نہیں ہو گا کہ وہ اپنے مخاطبین کی رعایت سے مثال کے طور پر یہ بیان کر دے: 'وما قتلوا عيسى ابن الله'۔ کہ انھوں نے اللہ کے بیٹے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔

www.javedahmedghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ عذاب دنیوی ہو یا اخروی، ہر انسان کے لیے نجات کا معیار اس کا ایمان ہی ہے اور یہ اصول قرآن میں جس طرح عمومی انداز میں بیان ہو گیا ہے، اسی طرح خاص حضرت نوح کے معاملے میں بھی اسے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ اس بنیادی اصول میں استثنا لانے کے لیے ضروری ہے کہ محکم درجے کی کوئی نص پیش کی جائے کہ اس ذیل میں محض ''اشارے'' کنایے کسی بھی صورت کفایت نہیں کرتے۔

۳۔ امرأة نوح

خدا کے پیغمبر، نہ صرف یہ کہ حسن اخلاق کے داعی ہوتے اور اسی مقصد سے انسانوں کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں، بلکہ وہ خود بھی اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کے منکرین کو بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اخلاقی حیثیت ہی اُن کی دعوت کی اصل قوت ہے، اس لیے وہ اسے داغ دار کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ان پر براہ راست الزام لگانے کی کوئی راہ نہ پا سکیں تو ظاہر ہے، ان کا اگلا ہدف اب ان کے ازواج ہی ہوتے ہیں کہ جن پر بہتان تراشی کر کے وہ اپنے مذموم مقاصد کسی نہ کسی درجے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو ہم جانتے ہیں کہ آپ کے مخالفین نے اس مقصد سے پورا زور صرف کیا، مگر خدا کا فیصلہ یہی ہوا کہ انھیں کسی صورت میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے کہ اس میدان میں ان کی کامیابی اصل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی صریح ناکامی ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پروردگار عالم نے خود آگے بڑھ کر آپ کے ازواج کو ان تہمتوں سے بری قرار دیا، یہاں تک کہ مخالفین کی طرف سے اچھالی گئی اس گندگی سے بچانے کے لیے اپنی طرف سے کچھ مخصوص احکام بھی نازل فرمائے۔

اس روشنی میں دیکھا جائے تو اہل علم کی وہ راے سو فی صد درست لگتی ہے جس کے مطابق انبیاے کرام کے ازواج کافر تو ہو سکتے ہیں، مگر بد چلن اور بد اخلاق ہرگز نہیں ہو سکتے[۲۵]، اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن اور حدیث کے سارے ذخیرے میں اس طرح کی کوئی بات کہیں نقل نہیں ہوئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے انھی حضرات نے جب اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دکھانا چاہا کہ نبیوں کے اہل محض ان کے اہل ہونے پر نجات پا سکتے ہیں تو

۲۵۔ اصحاب رسول میں سے حضرت عباس جیسے اہل علم کی راے بھی حضرات نوح ولوط کی بیویوں کے متعلق یہی نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے بدکاری کا ارتکاب ہرگز نہیں کیا، ابن کثیر۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کے لیے انھوں نے ایک استدلال یہ کیا کہ نوح کا بیٹا اسی لیے نجات نہ پا سکا کہ وہ آپ کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔ اور وہ آپ کا حقیقی بیٹا نہیں تھا، اس بات کی وضاحت میں اس کے بعد یہ کہا کہ اُن کی بیوی نے اصل میں بدچلنی کا ارتکاب کیا تھا۔ مگس اور باغ کے جیسے اپنے اس استدلال کے لیے ان لوگوں نے یہاں سے دلیل اٹھائی ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ. (التحریم ۶۶: ۱۰)

"اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی تو اللہ کے مقابلے میں وہ ان کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مغالطے

اس آیت میں انبیاے کرام اور ان کے متعلقین کے بارے میں جو امر واقعہ ہے، اس کے خلاف ہرگز یہ بیان نہیں ہوا کہ حضرات نوح و لوط جیسی مقدس شخصیات کے ازواج نے کسی بدچلنی کا ارتکاب کیا۔ بلکہ اس میں صرف یہ کہا گیا ہے 'فَخَانَتٰهُمَا' کہ انھوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کا ارتکاب کیا۔ مگر انھوں نے اس خیانت کا مطلب یہاں بدچلنی کر دیا ہے تو اس کی وجہ اصل میں انھیں لاحق ہو جانے والے دو بڑے علمی مغالطے ہیں:

۱۔ خیانت کا عمومی مستعمل معنی بدچلنی ہے اور یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے "قرائن فراہم کرنے کا مطالبہ غیر علمی تقاضا ہے۔"

۲۔ "جب بھی میاں بیوی کی خیانت کا ذکر ہو اور یہ نہ بتایا جائے کہ وہ کس معاملے میں خیانت ہے تو مراد بدچلنی ہی ہو گی۔"

ازالہ

ان مغالطوں کے ازالے کے لیے چند باتیں سامنے رہنی چاہییں:

۱۔ ان کا کہنا کہ بدچلنی اس لفظ کا عمومی مستعمل معنی ہے، یہ ایک صریح مغالطہ ہے کہ لفظ اور اُس کے معنی کی ساری بحث مکمل طور پر سماع پر منحصر ہوتی ہے اور ان کی یہ بات سراسر قیاس اور اندازے پر مبنی ہے۔ اسے ہم

نے قیاس اور اندازہ اس لیے قرار دیا ہے کہ انھوں نے اس ''عمومی مستعمل معنی'' کے لیے نہ تو اہل زبان کی مراجعت کی ہے اور نہ وہاں سے اس کے شواہد نقل کیے ہیں اور نہ یہ بتایا ہے کہ اہل لغات نے بھی اسے اپنی کتابوں میں ثبت کیا ہے۔ صرف اور صرف ایک راے ہے جو ان کی طرف سے پیش کر دی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے، ان کی راے فقط ان کے کہنے پر تو نہیں مان لی جا سکتی اور خاص کر ہمارے جیسے طالب علم تو اسے کسی صورت نہیں مان سکتے جو خوش قسمتی سے ان پر اور ان کی زبان دانی پر رتی بھر بھی ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں۔

۲۔ میاں بیوی کے تعلق سے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس سے مراد لازمی طور پر بد چلنی ہو گی، اس مغالطے کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ اس میں بھی صرف اور صرف تحکم پایا جاتا ہے، و گرنہ قدیم عربی زبان میں ہماری معلومات کی حد تک اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ مرد و عورت کے تعلق میں بھی بد چلنی کے بجاے اپنے اصل معنی، یعنی امین بنا دینے کے بعد جو ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے، اسے ٹھیس پہنچانے کے لیے آتا ہے۔ اس کے بعد کلام میں پائے جانے والے قرائن ہوتے ہیں جو اس کے مرادی معنی کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ بے راہ روی اور بد چلنی ہے یا کچھ اور ہے۔ پہلی صورت کی مثال میں اُس روایت کو دیکھ لیا جا سکتا ہے جس میں کسی غیر سے تعلق بنانے پر اسے لایا گیا ہے:

وامراة غاب زوجها وقد كفاها مونة الدنيا فخانته بعده. (ابن حبان، رقم ۴۵۵۹)

''آخرت میں اُس عورت کی کچھ پروا نہ کی جائے گی جس کا شوہر کہیں چلا جائے اور اس کے باوجود کہ اُس نے تمام ضروریات زندگی اسے فراہم کر رکھی تھیں، وہ اُس کی غیر موجودگی میں اُس سے خیانت کرے۔''

دوسری کی مثال اُس روایت میں ہے جس میں یہ آدم و حوا کے لیے استعمال ہوا، مگر صرف اور صرف آدم کی بات نہ ماننے کے لیے آیا ہے:

ولولا حوالم تخن انثى زوجها الدهر. (بخاری، رقم ۳۳۹۹)

''اگر حوا آدم سے خیانت نہ کرتی تو کوئی عورت اپنے شوہر سے کبھی خیانت نہ کرتی۔''

آیت کا اصل مفہوم

ان مغالطوں کے ازالے کے بعد اب ہم اس آیت کا اصل مفہوم نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوا امۡرَاَتَ نُوۡحٍ وَّامۡرَاَتَ لُوۡطٍ ؕ کَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ فَخَانَتٰہُمَا فَلَمۡ یُغۡنِیَا عَنۡہُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا وَّقِیۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیۡنَ.(التحریم ۶۶:۱۰)

''اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی تو اللہ کے مقابلے میں وہ ان کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔''

آیت میں خیانت کا لفظ آیا ہے اور اپنے اصل معنی، یعنی حضرات نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کی طرف سے اُن کے باہمی اعتماد کو مجروح کرنے پر استعمال ہوا ہے اور اس کی تعبیر کے لیے اردو میں صحیح لفظ ''بے وفائی'' ہے۔ اب اس بے وفائی کی وضاحت میں جب ہم آیت اور اس کے سارے سیاق کو دیکھتے ہیں تو ان عورتوں کی بدچلنی کے لیے ہمیں کوئی ادنیٰ درجے کا قرینہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ، اس میں متعدد قرائن ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جو متعین طور پر بتا دیتے ہیں کہ اس خیانت سے مراد ان عورتوں کی طرف سے سرزد ہونے والا کفر ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر:

۱۔ پچھلی آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کفار اور منافقین پر سختی کریں اور انھیں بتا دیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ منکرین کے دو گروہ تھے جن میں سے پہلے اپنی بدعہدیوں اور دوسرے اطاعت و فرماں برداری کا حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے پکے خائن تھے۔ چنانچہ انھیں سمجھانے کے لیے بھی ایک کے بجائے دو عورتوں کی خیانت کی مثال دی ہے، اور اس طرح بتا دیا ہے کہ ان میں سے پہلی نے صریح کفر اور دوسری نے منافقت کرتے ہوئے اپنے شوہر سے یہ خیانت کی ہے۔

۲۔ اس آیت میں کفر کرنے والوں کو اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ انھیں خدا کے عذاب سے لازماً دوچار ہونا ہے اور اس ذیل میں بڑی سے بڑی نسبت بھی انھیں کوئی فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے۔ اس رعایت سے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سمجھانے کے لیے جو مثال دی جائے، اس میں کفر ہی کے جرم پر بتایا جائے کہ اُن سے پہلے نوح و لوط کی بیویوں نے جب اس کا ارتکاب کیا تو وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آکر رہیں اور پیغمبروں کے ساتھ اُن کی نسبتیں بھی انھیں کچھ فائدہ نہ دے سکیں۔

۳۔ یہاں فرمایا ہے: 'وَقِیۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیۡنَ'۔ ''اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔''۔اس سیاق میں 'الدّٰخِلِيْنَ' سے مراد حضرات نوح اور لوط کا کفر کرنے والے ہیں اور اس کی مزید دلیل اس لفظ پر آنے والا الف لام بھی ہے۔اب ظاہر ہے، ان کفر کرنے والوں کی معیت میں ان کی سزا میں داخل ہونا، اُسی وقت معقول اور عدل کے مطابق ہو سکتا ہے جب مان لیا جائے کہ یہ عورتیں بھی کفر کرنے والی ہیں اور اسی لیے کافروں کی معیت میں ان کی سزا میں داخل ہو جانے والی ہیں۔

۴۔ ان عورتوں کی خیانت پر جو سزا جس طریقے سے اور جس طرح قیامت سے پہلے سنادی گئی ہے، قرآن کے رمز شناس جان سکتے ہیں کہ یہ محض غیر اخلاقی حرکت کے ارتکاب پر سنائی ہوئی سزا ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ، اس کی وجہ ان عورتوں کا کفر ہے کہ اس انداز میں کفر کرنے والوں کا انجام بیان ہوا کرتا ہے اور وہ بھی اُن کفر کرنے والوں کا کہ جن پر ہر طرح سے اتمام حجت کیا جا چکا ہو۔

غرض یہ کہ ان قرائن سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں خیانت سے مراد اصل میں ان عورتوں کا کفر ہے۔ سو اب سادہ لفظوں میں آیت کی تفہیم کچھ یوں بنتی ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کفر کرنے والوں کو دو عورتوں کی مثال دی گئی ہے جو حضرات نوح اور لوط علیہما السلام کے عقد میں تھیں۔ یہ عقد چونکہ میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کے لیے امین بناتا اور اس طرح اُن کے درمیان میں ایک طرح کا اعتماد پیدا کر دیتا ہے، اس لیے اُن حضرات کو اپنی بیویوں سے بڑی امید تھی کہ وہ دعوت حق کو سبقت کرتے ہوئے قبول کریں گی اور اس کام میں اُن کی موید اور معاون بن کر رہیں گی۔ یہ امید اس لیے بھی بہت زیادہ تھی کہ وہ صرف خدا کے ان نیک بندوں کے عقد میں نہ تھیں، بلکہ ان کی تولیت میں اور ان کے زیر تربیت بھی تھیں۔ 'فَخَانَتٰهُمَا'، مگر انھوں نے اس سب کے باوجود ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی جب سچے دل سے ایمان لانے کے بجائے کفر کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ اپنے اس کفر کی وجہ سے وہ خدا کے عذاب کی گرفت میں آکر رہیں اور پیغمبروں کے ساتھ اُن کی نسبت بھی اُن کے کچھ کام نہ آسکی۔

اعتراضات

آیت کے اس مفہوم پر ان لوگوں کی طرف سے چند اعتراضات کیے گئے ہیں:

ا۔ ہم نے لکھا تھا کہ خیانت کے لفظ کا عمومی مستعمل معنی قدیم عربی زبان میں بہر حال بد چلنی نہیں ہے۔ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ ان کی بات غلط سمجھی گئی ہے، اس لیے کہ ان کا مطلب تو عمومی مستعمل معنی سے ''صرف یہ تھا کہ یہ جس معنی میں عموماً مستعمل ہے۔''

قارئین جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے خیانت کے لیے نہ صرف یہ کہ ''عمومی مستعمل معنی'' کی اصطلاح برتی تھی، بلکہ اسے موکد کرنے کے لیے ''پینا'' کے لفظ کو بھی پیش کیا تھا جو ہماری زبان میں اسی کی ایک مثال ہے۔ اس پر ہم نے اپنی گزارشات پیش کر کے بتایا تھا کہ عربی زبان میں خیانت کا اس طرح کا کوئی مستعمل معنی موجود نہیں ہے۔ بہت اچھا ہوتا کہ یہ لوگ ہماری بات کو تسلیم کرتے یا پھر اس پر کوئی تنقید ہی لکھ ڈالتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ایسا تو کچھ نہیں کیا، البتہ، اپنے اس لافانی جملے سے ہمیں مبہوت ضرور کر دیا ہے کہ عمومی مستعمل معنی سے ان کا ''مطلب تو صرف یہ تھا کہ یہ جس معنی میں عموماً مستعمل ہے''[26]۔ اس عجیب وغریب توجیہ پر ہم کسی بحث میں پڑنے کے بجائے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ اگر ان کی مراد مستعمل معنی نہیں ہے تو پھر اس جملے کا مطلب کیا ہے کہ ''جب بھی میاں بیوی کی خیانت کا ذکر ہو اور یہ نہ بتایا جائے کہ وہ کس معاملے میں خیانت ہے تو مراد بدچلنی ہی ہو گی۔'' ہمارے خیال میں یہی تو وہ چیز ہے جسے مذکورہ اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اگر یہ جملہ عمومی مستعمل معنی کو بیان نہیں کر رہا تو کم سے کم وہ اس جملے کے بارے میں یہ تو بتا دیں کہ اس کی قدیم عربی مصادر میں دلیل کیا ہے؟

۲۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ خیانت کو جب مرد و عورت کے حوالے سے لایا جائے تو اس کے لیے اردو میں قریب تر لفظ 'بے وفائی' ہے۔ یہ خیانت کا ہر طرح سے متبادل ہے اور اسی کی طرح کسی خاص معنی میں مستعمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ شوہر کی بات نہ ماننے، اُس کا ساتھ نہ نبھانے، اُسے اکیلا چھوڑ جانے اور کسی غیر سے راہ ورسم بڑھانے، ان سب معانی میں آتا ہے اور اس کے بعد مذکور قرائن ہوتے ہیں جو اس کے مرادی معنی کی تعیین کرتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض نما دعویٰ کیا گیا ہے کہ اردو میں بے وفائی کے لفظ کو جب ''میاں بیوی کے لیے بولا جائے تو بدچلنی ہی کے معنی دے گا، شرط یہ ہے کہ بے وفائی کی وضاحت نہ آ گئی ہو۔''

اردو زبان میں ''بے وفائی'' اپنے اصل معنی اور اپنے اطلاقات میں اس قدر واضح ہے کہ ان کے دعویٰ پر کوئی تنقید کرنے کے بجائے ہم عرض کریں گے کہ اس معاملے میں اردو کے کسی اچھے لغت کی مراجعت کر لی جائے یا کچھ اور نہیں تو اردو شاعری میں اور عام بول چال میں اس لفظ کا متنوع استعمال دیکھ لیا جائے۔ یا کم سے کم اُن مظلوم شوہروں ہی سے پوچھ لیا جائے جنھوں نے کسی اور بات پر نہیں، بلکہ صرف روٹھ کر چلے جانے پر اپنی

۲۶۔ ہمیں وہ صاحب یاد آ گئے جن کے بزرگوں کے بارے میں کسی مخالف نے لکھ دیا کہ وہ سیاہ رنگ کے تھے۔ اس پر انھوں نے اسی طرح کا فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہر گز نہیں، حضرت تو بس گہرے گندمی رنگ کے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

بیویوں کو بے وفا قرار دیا اور اس پر وہ کمال درجے کی شاعری کی ہے کہ بخت و نصیب کی طرح اپنے تمام بیاض بھی سیاہ کر لیے ہیں۔

۳۔ ہم نے مذکورہ آیت میں خیانت کے مرادی معنی کی تعیین کے لیے اس کے سیاق و سباق میں سے پورے چار عدد قرائن پیش کیے تھے۔ کوئی نقد کرنے کے بجاے انھوں نے ایک ہی وار میں یہ کہتے ہوئے ان سب کو اڑا دیا ہے کہ یہ محض ''لاطائل تقریریں ہیں''۔ اور اس کے بعد اپنے مخصوص علمی انداز میں کہا ہے کہ اس طرح کی بحثیں ''معنی کے نہیں، بلکہ مدعا کے تعین کے لیے ہوتی ہیں۔'' مثلاً، قرآن میں ''فرشتوں کے سجدے کا ذکر کہیں اسوۂ حسنہ کے بیان کے لیے ہوا اور کہیں فرماں برداری کے لیے۔ لیکن کہیں بھی 'فسجدوا' کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ فرشتوں نے اچھا اسوہ دکھایا یا انھوں نے فرماں برداری کی۔ لیکن یہ مدعاے کلام ضرور ہو سکتا ہے۔''

معلوم نہیں کس جذبے سے ان لوگوں نے اسے مدعا کی بحث قرار دے دیا ہے۔ وگرنہ مدعا اور معنی کی تعیین میں کیا فرق ہوتا ہے، الحمد للہ، اس کی تھوڑی بہت واقفیت ہم بھی رکھتے ہیں اور اسی بنا پر نہایت اعتماد سے طالب علموں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنی بحث میں لفظ خیانت کے مرادی معنی کی تعیین کی ہے جب یہ بتایا ہے کہ اس سے مراد دین کے معاملے میں خیانت ہے کہ جو کفر کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، اور ہمیں سو فی صد یقین ہے کہ تمام اہل علم جو اس فرق سے بخوبی واقف ہیں، وہ بھی اسے معنی کی تعیین ہی قرار دیں گے۔ ہماری بحث تو اُس وقت مدعاے کلام کی بحث قرار دی جا سکتی تھی جب ہم نے خیانت کا معنی ''منکرین کو سزا مل کر رہنا'' یا ''نسب کا کام نہ آنا'' بیان کیا ہوتا کہ اس مقام پر یہی وہ مدعا ہے جس کا اِبلاغ متکلم کے پیش نظر ہے۔

۴۔ اس کے بعد ان حضرات نے اپنی طرف سے چند قرائن پیش کیے ہیں[27]۔ ان کا کہنا ہے کہ اولاً، 'امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ' اور 'كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ' کے الفاظ کے زیر اثر 'فَخَانَتٰهُمَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ثانیاً، یہاں خیانت کی وضاحت نہیں کی گئی۔ ثالثاً، بعد کی آیت میں سیدہ مریم کے بارے میں 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کے الفاظ ہیں جو موازنے کے اصول پر ازواج نوح و لوط کے لیے بد چلنی ثابت کر دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی دو باتیں اپنی ذات میں ہر گز قرائن نہیں ہیں، بلکہ اصل صورت حال کا بیان ہے کہ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں عورت و مرد کا ذکر ہوا ہے اور خیانت کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا

۲۷۔ یہ ان کی عنایت ہے کہ انھوں نے یہ قرائن اپنی اس راے کے باوجود پیش کر دیے ہیں کہ خیانت کا لفظ جب ان کے بغیر آئے تو اس کا معنی بد چلنی ہوتا ہے۔

جائے تو صرف تیسری بات اپنی ذات میں قرینہ قرار دی جا سکتی ہے، چنانچہ ہم اسی کے تناظر میں بتائیں گے کہ ان کا یہ ''قرینہ'' خیانت کے لفظ میں بدچلنی کا معنی کسی صورت بھی پیدا نہیں کرتا۔ بس چند باتیں سامنے رہیں:

'اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' کے الفاظ اس لیے بدچلنی کے لیے قرینہ نہیں ہیں کہ یہ خیانت کی طرح سیدہ مریم کے کسی فعل کو بیان کرنے کے لیے نہیں آئے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں عفت و عصمت کا بیان پایا جاتا ہے، مگر اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن کے محاورے میں یہ ان کے لیے ایک نام کی سی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اور یہاں اس کی دلیل ان پر آنے والا 'فَنَفَخۡنَا فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِنَا' کا جملہ ہے جو نتیجے کے طور پر آیا ہے اور اس نے ان کے اندر مریم بنت عمران کے تعارف کا پہلو غالب کر دیا ہے۔ اور اس کی دوسری واضح ترین دلیل یہ ہے کہ قرآن میں بعض مقامات پر اُن کا نام نہیں لیا گیا، بلکہ تعارف کے لیے محض 'وَالَّتِيۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' کے اِن الفاظ کو کافی سمجھا گیا ہے[28]۔

دوسرے یہ اس لیے بھی قرینہ نہیں ہو سکتے کہ آیت میں تنہا اسی وصف کو بیان نہیں کیا گیا کہ ہم اس کی روشنی میں خیانت کا معنی بدچلنی قرار دے لیں۔ یہاں ان کے دیگر اوصاف کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی کتابوں اور اس کے کلمات کی تصدیق کرنے والی اور نہایت فرماں بردار بندی تھیں۔ اب سیدہ مریم کے افعال ہی کی روشنی میں اگر خیانت کے معنی کی تعیین ہونی ہے تو پوچھنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ 'اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' کا وصف تو خیانت میں بدچلنی کا معنی پیدا کر رہا ہے، مگر اُن کا وصف تصدیق اور فرماں برداری اس میں تکذیب اور نافرمانی کا معنی پیدا نہیں کر رہا؟ بلکہ یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہم ان مرکب افعال کی روشنی میں خیانت کے معنی کی تعیین کریں اور اس سے مراد غیر صالح اعمال پر مشتمل ان عورتوں کا کفر اور انکار سمجھیں؟

تیسرے یہ کہ یہاں صرف سیدہ مریم کے اوصاف حمیدہ بیان نہیں ہوئے، بلکہ فرعون کی بیوی اور اُس کے اعلیٰ کردار کا بیان بھی ہوا ہے۔ موازنے کے اصول پر یہاں خیانت کا معنی طے کرنے والوں کو اس بات کا بھی جواب دینا چاہیے کہ زوجۂ فرعون کا کردار اس تعیین میں مکمل طور پر کیوں پس پشت ڈال دیا گیا ہے؟ اور ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کی روشنی میں خیانت کا معنی کفر کرنا اور اس پر مطمئن ہو جانا قرار دیا جاتا؟ بلکہ اس خاتون کا کردار تو یہاں اس لیے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کہ یہ 'اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' سے پہلے اور خیانت کے استعمال کے متصل بعد مذکور ہوا ہے۔

۲۸۔ الانبیاء ۲۱: ۹۱۔

''قرینہ'' کی حقیقت جان لینے کے بعد اب طالب علموں کو اس مقام پر بیان کیے گئے موازنے کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں دو عورتوں کے مقابلے میں دو عورتوں کے کردار کا بیان ہوا ہے۔ حضرات نوح اور لوط کی بیویوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اچھے ماحول کے باوجود کفر کا ارتکاب کر بیٹھیں اور انھیں خدا کے نیک بندوں کی تولیت میں رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔[29] مگر اس کے مقابلے میں فرعون کی بیوی ظلم پر مبنی نظام میں رہتے ہوئے بھی صرف اور صرف آخرت کی متلاشی رہی اور مریم اپنے زمانے کے حالات اور بنی اسرائیل کی اخلاقی گراوٹ کے باوجود اپنی عفت و عصمت کو بچائے رہیں اور ایمان و اسلام پر ہمیشہ قائم رہیں۔ گویا اصل موازنہ یہاں ان عورتوں کے کسی خاص فعل میں نہیں، بلکہ اس امر میں ہے کہ اچھے اور برے ماحول میں دو مختلف طبیعت عورتوں کے کردار میں کیا فرق واقع ہوا۔

حاصل بحث

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس ساری بحث کو چند نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قرآن میں کسی نبی کے ازواج کے بارے میں بدچلنی کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

۲۔ جن حضرات نے اس کے خلاف دعویٰ کر دیا ہے، انھوں نے بنا کسی قرینے کے محض خیانت کے لفظ سے اس کا معنی پیدا کرنا چاہا ہے۔

۳۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کے اِثبات میں قرآن کے کسی صریح مقام کی نشان دہی کریں۔

۲۹۔ یہاں 'تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ' کے الفاظ اس مقصد سے نہیں آئے کہ یہ عورتیں ان حضرات کی بیویاں ہیں جیسا کہ ان حضرات کو اس کا مغالطہ ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ ''نوح کی بیوی'' اور ''لوط کی بیوی'' جیسے صریح الفاظ بول دینے کے بعد اب اس طرح کے کسی قرینے کی بھلا کیا حاجت ہو سکتی ہے۔